

سستم درم

درد اسنہ نوشین حسان

”اللہ دتا..... آ میرا پتر..... انڈوں کی بھانجی تیار
ہے..... مگر ماگم روٹی اتارتی ہوں، کسلی سے بیٹھ کر کھالے۔“
اللہ دتے کی اماں نے مٹھاس بھرے لہجے میں
بلا یا۔ اس کی بیوی باورچی خانے والے چھپر میں آٹا
گوئدہ رہی تھی۔ اس کی بڑی بیٹی سولہ سالہ لائیبہ اپلوں
کی آگ پر دودھ کی پھلی رکھے دھیان کر رہی تھی۔
چھوٹی بیٹی بارہ سالہ صامیہ سوتیوں کا زردہ لیے دونوں
چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کھا رہی تھی۔

اللہ دتا ہاتھ دھو کر چھپر گے پاس چارپائی پر
آ بیٹھا۔ وہ پریشان دکھائی دے رہا تھا۔ اس کا دل
دھواں میں گھرا ہوا تھا۔ آج ہی اس کی اچھی بھلی گائے
کو کبھی کی بیماری لگ گئی تھی۔ تین بکریاں اور دو بھیڑیں



ہے۔“ وہ چہرے پر دو پٹا گرڑتے ہوئے بولی۔
 ”اڑی دھی..... یہ تو وہی ناسور ہے جو پہلے
 کانوں کو ہوا پھر بندوں کو ہونے لگا۔“
 ”ہائے اللہ..... سچ.....“ قریب بیٹھی عورت
 ایک دم پرے کھسک گئی۔ لائیبہ شیشہ دیکھنے بھاگی.....
 کوئی اس کی ماں سے کہہ رہی تھی۔
 ”لائیبہ کی ماں، تو نے چاچی زبیدہ کا حال دیکھا
 تو تھا۔ پہلے ایک دودا نے پھر سارا بدن بھر گیا تھا۔ اللہ
 توبہ، اللہ توبہ.....“

لائیبہ کی ماں کو گائے کی تعزیت بھول گئی۔ چاچی
 زبیدہ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر گیا جس کا چہرہ،
 گردن، کمر، پیٹ، بازو، رانیں بڑے، بڑے زخم نما
 چھالوں سے بھر گئے تھے۔ جن پر کھیاں چٹی ریتیں
 مکھیوں کی وجہ سے کیڑے بڑ گئے۔ جسم سے بدبو اٹھنے
 لگی۔ کئی دن اذیت کے گزار کر کبھی طرح سچ گئی تھی۔
 لائیبہ نے شیشہ کیا دیکھا غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔
 وہیں فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔ صامیہ دوڑی پانی کا
 گلاس بھر لائی۔ تسلی دینے لگی۔

”ابا شہر کے ڈاکٹر کو دکھائیں گے ٹھیک ہو جاؤ گی۔“

دادی اور ماں پریشانی چھپا کر طفل تسلیاں دے
 رہی تھیں۔ اللہ دتا کھیتوں میں کام کر رہا تھا۔ خبر ملی تو
 ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اس کے گھر آنے تک لائیبہ کے
 جسم پر جگہ، جگہ زخم نما چھالے پھیل گئے تھے۔ گھر کا ایک
 ہی کمرہ تھا۔ دوسرا باورچی خانے کا چھپر اور تیسرا
 بکریوں کا باڑے والا چھپر تھا۔ دادی نے کمرے میں
 سب کا آنا جانا روک دیا، دیکھ بھال کے لیے خود کو
 مخصوص کر لیا۔ کمرے میں ڈیوئل چھپر کا اور اپنی طرف
 سے حفاظتی انتظام کیا۔ اللہ دتا لائیبہ کو موٹر سائیکل پر
 ڈپنسری لے گیا۔

زخموں پر لگانے اور کھانے کی دوائیاں شروع تو
 ہو گئیں مگر مسئلہ یہاں بھی مکھیوں کا تھا..... جب تک بجلی
 رہتی پنکھا چلا رہتا تو کچھ سکون رہتا مگر بجلی کبھی پانچ
 گھنٹے چلی جاتی کبھی گھنٹے بعد آتی جاتی رہتی۔ ان گنت
 مسائل کا کوئی پرسان حال نہ تھا۔ دستی پٹکھے جھل، جھل

اسی ہاڑے میں تھیں۔ ان کو محفوظ رکھنے کی خاطر ناچار
 گائے کو دور کسی درخت سے باندھ کر آ رہا تھا۔ باہر
 مردوں میں اسی بیماری کی بات ہوتی رہی۔ گاؤں کے
 دودھ دینے والے مویشی اس کا شکار ہوتے چلے
 جا رہے تھے۔ مویشی کی کھال پر ابھرے آبلوں پر
 جھنجھنائی کھیاں اس کو تیزی سے پھیلا نے کا سبب تھیں
 اور کھیاں روکنا کسی کے بس میں نہ تھا۔ وہی ہوا جس کا
 ڈر تھا، دو دن بعد اللہ دتا کی گائے مر گئی۔ سوا لاکھ کا
 نقصان ہو گیا۔ معمولی درجے کا کسان تھا۔ اس نقصان
 نے کمر توڑ دی۔ بہت رنج ہوا۔ گھر پر ماں اور بیوی غم
 سے فرش نشین ہو گئی تھیں۔ اللہ دتا نے اپنی پیاری مردہ
 گائے کو سچ کھانچ کے اس کھڈے میں ڈالا۔ جہاں
 پہلے سے بدبو چھوڑتے گلتے سڑتے مرے ہوئے
 مویشیوں کا ڈھیر بڑا تھا۔ ان کے اوپر موٹے، موٹے
 چھروں کی یلغار تھی۔ لائیو اسٹاک والے زبانی تلقین
 کر دیتے کہ مردہ مویشی کو گڑھے میں ڈال کر مٹی سے
 ڈھانپ دیں۔ مگر عمل محکمہ کرنا نہ لوگ..... اس کھڈے
 کے نزدیک تو کیا دور سے بھی ناک پر رومال رکھ کر گزرنا
 محال تھا۔ انسانوں کی وبا پر تو کچھ نہ کچھ تردد کر لیا جاتا
 ہے جانوروں کی وبا کو اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا گیا
 تھا۔ بیچارے غریب کسان اپنی مدد آپ کے تحت ہی
 کچھ کرتے ہیں۔

اللہ دتا گھر پہنچا..... سیدھا نکلے پہ گیا۔ نہا کر کپڑے
 بدلے..... لائیبہ بڑا کپڑا لہرا لہرا کر کمرے سے کھیاں نکالنے
 کا کاربیکار کر رہی تھی۔ کمروں کے دروازوں پر جالیاں نہیں
 تھیں۔ دروازے کھلے رہتے۔ کھیاں نکالنا یا نہ نکالنا برابر
 تھا۔ یہی حال ہستی کے ہر گھر کا تھا۔

بڑے مال (مویشی) کا مر جانا، تعزیت کی بات
 گردانی جاتی تھی۔ عورتیں مرد افسوس کرنے آتے جاتے
 رہتے۔ لائیبہ نے ویٹرے میں جھاڑو دے کر جھاڑو ایک
 طرف رکھا اور نکلے پر ہاتھ منہ دھو کر آئی، کسی عورت نے
 اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”یہ ترے گال پر کیا ہوا ہے۔“

”ہاں نہیں کچھ کاٹ گیا ہے..... مجھے جلن ہو رہی

ابا دوڑ کر ڈسپنسری سے کپوڑ (کمپاؤنڈر) کو بلا لایا۔ ماسک لگائے ہاتھوں پر دستانے چڑھائے وہ آیا۔ ٹیکہ لگایا۔ جس کے کچھ دیر بعد لائے ہوئے۔

دم درود، علاج دوا سب طرح کی کوشش بہتری الٹی۔ اللہ کا فضل ہوا رفتہ رفتہ بیماری کا زور ٹوٹا۔ جلد صاف ہونے لگی۔ درد اور جلن ختم ہونے لگی۔ بخار بھی اتر گیا۔

جس دن لائے ہوئے غسلِ صحت کیا دادی نے اس خوشی میں خود گڑ کے چاول پکائے حالانکہ وہ اب پکانے کا کام کم ہی کرتی تھی۔ وہ خوشی بھری شام تھی۔

مغرب کی نماز ہو چکی تھی۔ صحن میں بھی چار پائیوں پر بہن، بھائی اچھل کود کر رہے تھے جب ایک چار پائی پر گڑ کے چاولوں کا تھال لا کر رکھا گیا تو سب وہیں آ بیٹھے۔ مل جل کر کھانے لگے۔ چاول کھانے کے بعد اماں نے دادی، ابا اور اپنے لیے تین پیالے چائے بنا کیے۔ چھوٹوں کو چائے کی عادت نہ تھی۔ چائے پی رہے تھے کہ بڑا چاچا گرم الہی اور چھوٹے چاچو آ گئے۔ امی نے لائے ہوئے صامیہ سے کہا ان کے لیے چاولوں کی تھالی بھر لائیں۔

کرم الہی اور چاچو سیلاب کی سنی سنائی خبریں بتانے لگے۔ چاول کھا کر فارغ ہوئے تو تینوں باہر چلے گئے۔ یہاں کئی سالوں سے سیلاب نہیں آیا تھا۔ بارہ سال پہلے کے بڑے سیلاب میں بھی بچت ہوئی تھی۔ اس لیے سیلاب کا خوف کم تھا۔ باتیں فسانہ لگتی تھیں۔ موبائل تو اب ہر بندے کے پاس ہوتا ہے، سیلاب کی وڈیوز دیکھتے افسوس کرتے، توبہ استغفار کرتے پھر بھول جاتے۔

مگر کچھ ہی دنوں بعد حکومتی کارندوں کی طرف سے بستی کو احتیاطاً خالی کرنے کا اعلان ہونے لگا۔ اس اعلان سے سراسیمگی تو پھیلی مگر کسی نے گھر نہ چھوڑا۔ بستی خالی نہ کی۔ جلدی اعلان میں سے ”احتیاطاً“ کا لفظ فوری طور پر ”میں بدل گیا۔ مسجدوں سے بار، بار اعلان ہونے لگا۔ گاؤں فوری طور پر خالی کر دیا جائے۔ خوف و ہراس مزید پھیلا۔ جانور ہانگے جانے لگے۔ جن کے بکے کوٹھے تھے، وہ چھتوں پر سامان رکھنے لگے۔ شام ڈھل رہی تھی۔ اکثر لوگوں نے یہی سوچا صبح

کردادی کا بازو شل ہو جاتا تو صامیہ ماسک لگا کر ڈیوٹی سنبھال لیتی۔ حفظانِ صحت کی معمولی شد بد تھی۔

لائے ہوئے کا ماموں زاد نکیل سے بچپن سے رشتہ طے تھا۔ آنا جانا رہتا تھا۔ مامی دیکھنے آتی مگر ناک پر دوپٹا رکھ کر کمرے کے باہر کھڑی رہی۔ توبہ استغفار کرتی رہی۔ نکیل بھی آیا تھا۔ لائے ہوئے پشت موڑ کر دوپٹے کا گھونٹ کھینچ لیا۔ نکیل کا رویہ بہتر تھا۔

”اللہ خیر کرے گا..... خیر ہوگی ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ بولا۔

مگر اس کے جانے کے بعد لائے ہوئے پھوٹ، پھوٹ کر رونے لگی۔

”ہمارے ساتھ یہ کیا ہوا؟ اتنا برا کیوں ہوا..... پہلے ابا کی گائے حرام ہو گئی جس کے دودھ پر گزارہ تھا..... اسے بیچ سکے نہ حلال کر سکے..... پھر..... میری باری آ گئی..... چاچی زبیدہ کو دیکھ کر سب کو گھن آتی تھی۔ مجھے بھی دیکھ کے سب کو گھن آتی ہوگی..... کیوں اے اللہ..... غریبی ہمارے لیے..... بیماری ہمارے لیے..... ہم سے بدتر اس دنیا میں کوئی نہ ہوگا.....“ وہ دہانی دینے لگی۔ دادی نے آگے بڑھ کر پچکارا۔

”نہ کہہ لائے..... ایسے نہ کہہ..... توبہ کر دھی..... شکر ادا کرتے ہیں اب بھی بہتوں سے بہتر ہیں..... گائے بغیر بھوکے تو نہیں مر رہے، دو وقت کی پیٹ بھر کر کھاتے ہیں، چمت ہے، عزت ہے، برداری ہے، سارے سر سلامت ہیں، بیماری مومن کے گناہوں کا صدقہ ہوتی ہے۔“

”ہاں، ہاں بہتوں سے بہتر ہیں مگر بہت ہم سے بہتر بہتر ہیں۔ مجھے اپنے آپ سے تو آتی ہے، مجھے اپنا آپ کوڑھی لگتا ہے۔ دادی تم لوگ مجھے تھکاتے ہو میں ڈال آؤ گے.....“ لائے ہوئے نے تو بالکل ہی دل چھوڑ دیا تھا۔ کسی کے کہنے سننے میں نہیں آتی تھی۔ ماں، بہن، بھائی سب ہی اس کے پاس آ گئے، اس کی بے قراری اور اضطراب دیکھ کر قاصدے اور پرہیز کا خیال تک بھول گیا۔ وہ تو دیوار پر سر مار، مار کر رو رہی تھی۔ بالکل ہی صبر کا دامن چھوڑ دیا تھا۔

کرنے لگی۔ کسی اللہ کے بندے نے ڈوبتی صامیہ کو کھینچ نکالا تھا..... مگر عمر کا نام نشان نہ دکھتا تھا۔ پوچھت رہی تھی، صبح کا ذب، صبح صادق میں بدل رہی تھی۔ کہیں رکنے کا مقام نہ تھا، کوئی وسیلہ نظر نہیں آتا تھا۔ دائیں، بائیں دیکھتے آوازیں دیتے، دہائی دیتے، روتے آگے بڑھنے پر مجبور تھے۔

ہجوم میں سے کوئی راہ پڑتے درخت پر چڑھا۔ کوئی گرا اور ایسا ڈوبا کہ کم ہو گیا۔ کوئی پھسل کے ابھر آیا۔ کتنے چلے تھے کتنے بند تک پہنچے اللہ ہی جانتا تھا۔ جب سانس لینے کی مہلت ملی تو لبوں پر ماتم جاری ہوئے۔ اضطراب اتنا تھا کہ رونے بھی نہ دیتا تھا۔ سکون اٹھتے، بیٹھتے کسی بل نہ تھا۔ کبھی لگتا عمر مل جائے گا، عمر زندہ ہوگا کبھی لگتا یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو آنکھوں کے سامنے سیاہ دھبے کی طرح غرقاب ہو گیا تھا۔ اپنا آپ مجرم لگتا کہ اسے بچانہ پائے۔

رک کر بیٹھنے اور غم منانے کا یہ بھی مقام نہ تھا۔ یہاں بھی ”بھاگو، دوڑو، پانی چڑھ رہا ہے، بند کی مٹی ٹوٹ رہی ہے.....“ کے غل نے ہنکا دیا۔ پتا نہیں کس طرف اور کیوں چل رہے تھے۔ ٹانگیں شل ہو رہی تھیں۔ ہمت جواب دے رہی تھی۔ مسلسل پانی میں ڈوبے پاؤں سوج گئے تھے..... کوئی سڑک دکھائی دی سڑک پر بھی پانی آر پار بہہ رہا تھا۔ مگر ڈوبنے جتنا پانی نہیں تھا۔ دادی کا بنتی ہوئی وہی ڈھیر ہو گئی۔ کمزور بیمار بوڑھے بچے تھک پار کر بیٹھتے چلے گئے۔

یہاں دادی بھی جو بازو پر سرنکائے، ہائے، ہائے کرتی تھی۔ ماں بھی جس کی آنکھیں رو، رو کر اتنی سوج گئی تھیں کہ کھلتی نہ تھیں۔ اللہ دتا تھا جو کبھی اٹھ کھڑا ہوتا تو کبھی بیٹھ جاتا..... پھر گردن اچکا کر آگے پیچھے دیکھتا جیسے کچھ ڈھونڈ رہا ہو..... کبھی دونوں رانوں پر ہاتھ مارنے لگتا۔ چاچا اسد کو گود میں دبکائے بیٹھا تھا۔ لائبہ اور صامیہ آپس میں دُکبی ہوئی تھیں یوں لگتا انہیں جیسے سر سے دوپٹے پہنچ کر مردوں اجنبیوں کے ہجوم میں دھکیل دیا گیا ہو..... تین وقت سے کسی کے پیٹ میں کھانا نہیں پڑا تھا۔ کھانا تو ایک طرف پانی ہی نہیں

سورے نکل جائیں گے۔ سیلاب اتنی جلدی نہیں آئے گا۔ یہ وقت خیر سے نکل جائے گا۔ اللہ دتا بھی کمرے کی چھت پر کھانے اور سامان اور ضروری چیزیں رکھوا کر مسجد چلا گیا۔ نمازیوں میں بھانت، بھانت کی بولی تھی۔ تاہم اکثر کا خیال تھا پانی کو خطرے کا نشان پار کرنے میں وقت لگے گا لیکن یہ پکا خیال کچا ثابت ہوا۔ پچھلی رات کا پہر تھا، ابھی فجر کی اذانوں میں کچھ دیر تھی کہ سیلاب آفت ناگہانی کی طرح بستی میں داخل ہو گیا۔

”پانی آگیا، پانی آگیا.....“ شور اٹھا، سونے والے جاگ گئے، چیخ و پکار، بچوں کے رونے، مدد فریاد کی آوازوں میں یلغار مارتے پانی کی گڑگڑاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ پانی تو گولی کی رفتار سے پھیلتا اور اونچا ہوتا جا رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے پوری بستی پانی میں ڈوب رہی تھی۔ چھتوں پر چڑھنے کا موقع ہی نہیں تھا۔ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر سب اندھا دھند بھاگ رہے تھے۔ کسی ایک سمت کو بھاگ رہے تھے (جس طرف دریا کا اونچا بند تھا) چھوٹے بچوں کو مردوں نے کاندھوں پر اٹھا رکھا تھا۔ اللہ دتا کا چھوٹا بیٹا اسد سات سال کا تھا اور بڑا عمر دس سال کا۔ عمر اور اس سے بڑی بارہ سالہ بہن صامیہ سب پانی میں دھکے کھاتے... لڑکھڑاتے چل رہے تھے کیونکہ کم وزن اور چھوٹی چیزوں یا انسانوں کو پانی تینکے کی طرح سمیٹا موج بلا کا زور دکھاتا بہاؤ میں ساتھ لیے جاتا تھا۔ اسد کو ابانے کاندھے پر بٹھالیا۔ باقی کس نے کس کا ہاتھ پکڑا کسی کو خبر نہ تھی۔ منہ زور پانی سے جنگ تھی اور وہ پانی کے مخالف سمت چل رہے تھے۔ پانی کی سمت پر چلنے کا مطلب دریا میں جا گرنا تھا۔ مخالف سمت پر ایک ٹیلا تھا جو کل تک تو تھا اب نہیں رہا تھا کہ رہا ہے یا ڈوب گیا۔

”ہائے ابانہ..... ہائے اللہ.....“ صامیہ اور عمر کا آپس میں ہاتھ چھوٹا۔ ”وہ گئی صامیہ.....“

”وہ گیا عمر.....“

لائبہ چلانے لگی۔ اماں دیوانہ وار پانی میں ہاتھ مارنے لگی۔ دادی..... ”رحم، رحم.....“ کی گردان

وہ کروٹیں بدلتی اور کہتی تھی۔

”گھر کہاں رہا اب..... کچھ..... گارا..... مٹی بنوا (راکھ)“ اماں نے ماتھے پر ہاتھ مار کر بیزاری سے کہا۔
”کچھ تو بچا ہوگا..... ہم لیپ پوت کے بنالیں کے.....“ صامیہ کی بات پر ماں نے چشم تصور سے اپنے ایک بیٹے سے خالی گھر دیکھا اور انگشت شہادت اٹھا کر ”نہ، نہ“ کے اشارے پر لہرانے لگی۔

”ہائے میرا عمر..... میرا پتر..... میرا بچہ..... میرا لعل..... کیسی مصیبت ہم پر ٹوٹی۔ میرا کبر و عل گیا..... گھر گیا، چھت گئی، رُل گئے ہم..... کچھ نہ کر سکے.....“
”اماں جی بہت بھوک لگی ہے.....“ اسد منمنایا۔
”مجھے تو لگتا ہے ہم بھوک سے مر جائیں گے، پیٹ میں مروڑاٹھ رہے ہیں۔“ صامیہ بھی بھوکی تھی۔
”رویائیں جاتا..... آنسو نہیں رہے، گلا خشک ہو گیا ہے۔“ لائبہ نے اپنے گلے پر ہاتھ رکھا۔
”رونے سے روٹی مل جاتی..... میں اب بھی رو لیتی.....“ صامیہ نے عجیب بات کی۔

اگلے دن کی سہ پہر کو نمکین چاولوں کے شاہر، کھجور اور پانی کی بوتلیں ملی۔ ایسے لگا دیئے والا کتنا سخی، ان داتا، مہربان اور اچھا ہے اور ایسے لگا کہ ہر درد کا مداوا پیٹ بھر کر کھانا اور پانی ہے یا کم از کم دردِ ہجر..... دردِ ضیاع، دردِ مسافرت کی الگ، الگ شناخت پیٹ بھرنے کے بعد ہوتی ہے۔ چائے، دودھ، میٹھا نمکین پھل، میوے یہ سب ثانوی چیزیں ہیں، اصل رمز حیات لکا ہوا انسانوں کے لائق کھانا اور صاف پانی..... نہ کہ گھاس پتے ڈنھل، ٹہنیاں اور گدلا حشرات والا پانی..... سیلاب زدگان کے ہجوم میں طرح، طرح کی آوازیں تھیں بیمار آوازیں، روتی بسورتی آوازیں..... گڑگڑاتی فریادیں، کھانسنے کی مسلسل آوازیں، کراہیں اور ان کے بچ کہیں باشعور باتیں.....

”2010ء میں بڑا سیلاب آیا تھا۔ قدرت نے ہمیں بارہ سال موقع دیا..... وقفہ دیا..... ہم دوبارہ اس مصیبت سے بچاؤ کا چارہ کار کر لیتے..... چلو ملک ڈیم نہیں بنا سکتا کہ غریب ہے..... سیلاب کے خطرے والے

تھا۔ دریا کا میلا پیلا ملک بچا پانی لی رہے تھے۔ رفع حاجت ضرور یہ کی کوئی جگہ نہ تھی۔ کھلے آسمان تلے پہلی رات آ رہی تھی۔ کھلے آسمان تلے سونا کیا ہوتا ہے؟ چار دیواری چھت نہ چادر، چہار جانب غیر نگاہیں، عدم تحفظ، خوف، عزت، بھوک پیاس، لا چاری، بے بسی جانور پرندے بھی کسی غار، گھنڈر، کھونسے، گھروندے کا آسرا کرتے ہیں۔ اس پر غضب یہ کہ اپنے عزیز و اقارب جو کچھ گئے پاؤدب گئے۔

اس رات کی صبح ہوتے ہی ابا اور چاچا سب کی دیکھا دیکھی کسی کمپ ہاؤس کی تلاش میں چل پڑے۔ ایسی کوئی جگہ جہاں سیلاب زدگان کے لیے خیمے لگے ہوں، جہاں بے کسوں کے ہاتھ تھامنے والے نیک دل لوگ ہوں..... چلتے رہے اور راستوں میں سسکتے نیم مردہ لوگ دکھائی دیتے رہے..... چلتے رہے اور جھنڈ کے جھنڈ پیشہ ور گداگر امدادی قافلوں کے داخلے کی شروع جگہ میں نقلی کہانیاں سناتے، امداد لوٹنے یا بوڑھتے اور پھر بیچتے ملے..... اور کتنے بڑے گھروں والے بڑے لوگ ظرف کے بھکاری ملے..... اونچی پگوں والے جن کا لالچ آئے، چینی کے تھیلے پر بھی کم نہ ہوتا تھا۔ بے ضمیر، بے حس، بد صورت عدم انسانیت کی کثرت تھی۔ البتہ مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں جگنو بھر رحم، رحمت اور محبت کی روشنی ضرور ٹھمٹائی تھی۔

بالآخر سفر اس جگہ ختم ہوا جہاں کیلی زمین پر خیمے نصب تھے۔ بڑے شامیانے کے نیچے کئی، کئی خاندان بیٹھے تھے۔ ادھر عورتیں پشت کیے قطار باندھے بیٹھی ہیں تو ادھر مرد..... اللہ دتا بال بچوں کو لے کر بیٹھ تو گیا۔ زندگی قطار میں بیٹھے رہنے کا نام تو نہیں..... بچے رو کر ستاتے بڑوں کا بھی رونے کو دل کرتا..... انتظار اور راہ ٹکنے کے سوا کچھ اختیار میں نہ تھا۔ ڈھارس کے الفاظ زخم پر نمک چھڑکتے مرہم نہ بنتے۔ دادی کو تیز بخار چڑھا ہوا تھا۔ دوا کہاں سے ملتی، دوسرے دن تو پانی اور کچھ خوراک ملی تھی۔

”مولا..... میکوں میڈے گھر وچ موت ڈے۔“ (مولا..... مجھے میرے گھر میں موت دے)

ملاقاتوں کو نشان زد کر کے بکے بند تو باندھ سکتے تھے۔“
 ”او بھائی..... کون سا غریب ملک..... غریب تو ہم ہیں..... حکمران تو ناکوں ناک ٹھنسنے ہوئے ہیں..... یہ تو دعا مانگتے ہیں کہ کوئی آسانی، زمینی بلا ہم پر نازل ہو..... دنیا بھر سے امداد آئے اور یہ گھر بھریں۔“ ایک اور آواز ابھری۔

”ان کے پیٹ تو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔ ہم قبر میں جائے بغیر یہ مٹی کھانے پر مجبور ہیں۔“
 ”ہم کیا کریں؟ کہاں جائیں؟ کس کے آگے فریاد کریں؟ ہمارا کوئی والی وارث نہیں..... ہمارا کوئی پرسان حال نہیں.....“

”خوراک تو حیوان کی اول ضرورت ہے، خوراک کے علاوہ ماں بہنوں کا پردہ، نہانا دھونا اور ضرورتیں..... نہ سونے کی جگہ نہ بیٹھنے کی جگہ.....“ ایک بڑھا جو دیر سے خاموش بیٹھا تھا کھنکھار کر بولا۔

”سوال تو یہ ہے۔“ سب چپ ہو کر سننے لگے۔

”کیا ہماری بکل میں تو چور نہیں.....“

”کیا مطلب.....؟“

”ہم خود اپنے گناہوں پر نظر ڈالیں.....“

”بے شک ہر بندہ گناہ گار ہے۔“

”مگر ہم سے بڑے گناہ گار تو عیش میں ہیں.....“

”پتر..... ان کی سزا رب نے محفوظ رکھی ہوئی ہے اور..... یہ چھوٹی بات نہیں.....“

اوٹھتی ہوئی لائبرے کے کانوں میں ملے جلے فقرے

گوں گ رہے تھے۔ شدید گرمی تھی۔ پسینے سے بساندے

ہوئے دوپٹے میں منہ چھپائے نیند سے جھکے لے رہی

تھی۔ کبھی سردائیں لڑھک جاتا، کبھی بانیں، خواب میں

کوئی مر گیا تھا اور تازہ شور اٹھ رہا تھا..... وہ خواب سے

کھٹنا چاہتی تھی مگر آنکھیں کھولنا نہیں چاہتی تھی کسی اور

مصیبت کا سامنا کرنے کی طاقت نہ تھی مگر شور تھا کہ رکتا

نہیں تھا۔ آنکھ کھل گئی پتا چلا کہ ایسبولینس آئی ہوئی تھی۔

زیادہ بیمار بندوں کو لے گئی..... دادی بھی جا چکی تھی۔

”کاش دادی کی جگہ میں ہوتی۔“ لائبرے نے

حسرت سے سوچا۔ ”اب دادی سکون سے ٹائلیں پار

کر اسپتال کے بستر پر سوئے گی۔ چھتر ناک، کان میں نہیں گھستے ہوں گے..... جسم خارش سے چھلنی نہیں ہوگا..... پنکھا چلتا ہوگا، کھانا بھی اچھا لگے گا..... دادی کی توجہ جان چھوٹ گئی۔ جہنم سے جنت منتقل ہو گئی۔“

لائبرے نے غنودگی اور نقاہت سے بو جھل آنکھیں

پھر سے بند کر لیں۔ ایک ہی بد صورت منظر دیکھتے جی

اوتھتا تھا۔ غیر مردوں کے ہجوم میں سونے کا احساس.....

یاں پر نظر پڑتی تو ڈوب کے مر جانے والے کا غم چہرے پر

رقم ملتا..... باپ کو دیکھتی تو بیچارہ بحیثیت صاحب خانہ

اپنے گھر والوں کو تحفظ، پردہ، کھانا نہ دے سکنے کا سراپا

ملزم..... صامیہ کو دیکھنا گویا آئینہ دیکھنا تھا..... اور

چھوٹے اسد کو وہ دیکھ نہ پاتی تھی۔ یعنی دیکھ پانے کی

ہمت نہ ہوتی تھی رو، رو کر اس کا جبر اٹھ رہا ہو گیا تھا۔

اور کھلے منہ پر کھیاں، چھتر بھنھناتے تھے۔

بس نہ دیکھنا نجات تھا..... نیند نجات تھی۔

وہ ایک بار پھر نیند کی وادی میں کھو گئی۔

سامنے بھلی چٹکی دادی چار پائی پر بیٹھی اسے پنکھا جھل

رہی تھی۔ اس کے ہاتھ پاؤں لمبی کے زخموں سے بھرے

ہوئے تھے اور وہ غصے بھری دیوانگی سے کہے جاتی تھی۔

”کیوں..... اللہ..... کیوں، کیوں اللہ..... کیوں۔“

پنکھا پرے پھینک کر دادی آگے بڑھی۔

”لائبرے ایسے نہ کہہ..... دھی تو بہ کر..... اللہ نے کیا

چھینا ہے تجھ سے..... بھوکے نہیں مر رہے، چھت ہے،

عزت ہے، برادری ہے سارے سر سلامت ہیں.....

شکر ادا کیا کر.....“

”ہاں، ہاں.....“ پہلی بار دادی کی بات کا

مطلب سمجھ آیا۔ اپنی ہی بے ہنگم چیخ پر اس کا خواب

ٹوٹ گیا۔ اماں، ابا گھبرا گئے، اس کی طرف بڑھے۔

”کیا ہوا ہے؟“ سامنے کسی ادارے کی

لڑکیاں چادریں اور ادویات بانٹ رہی تھیں۔ اوپر

والے ہاتھ کی روشنی نیچے والے ہاتھ کی زندگی

تھی..... اور اسے کل کی روشنی بننا تھا اس کی آنکھیں

اب پوری کھل گئی تھیں۔

